انتخاب

کلامِ جوشؔ

مُرتّبۂ

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

اترپردیش اردو اکادمی
लखनऊ

سلسلہ مطبوعات : ۴۳۰

انتخاب

کلامِ جوشؔ

مرتبہ
ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

انتخاب
کلامِ جوشؔ

مرتبہ: ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

تیسرا ایڈیشن: ۲۰۰۲ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت: چھ روپے

ایس۔ سی۔ ورما، سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس آکرتی گرافکس پرائیویٹ لمیٹیڈ، ۵۶۔ سی، سنگار نگر، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

اردو کی ترقی و ترویج میں بشمول دیگر منصوبوں کے یہ بات بھی خصوصیت کی حامل رہی ہے کہ معیاری کتابوں کی اشاعت و طباعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے اس فرض کو بخوبی ادا کیا ہے اور اس میدان میں آج بھی وہ اپنے محدود وسائل کے باوجود کبھی غافل نہیں رہی ہے۔ اکادمی نے جہاں ادب کے دیگر موضوعات کے تحت نادر و نایاب مطبوعات کی اشاعت سے قاری کا دل جیتا ہے وہیں مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب میں شامل تدریسی کتب کو چھپوا کر طلبا کی ضرورتوں کو بھی کافی حد تک پورا کیا ہے۔ یعنی اکادمی نے نصابی کتب کو لاگت سے کم قیمت پر فروخت کر کے ایسی راہ استوار کر دی ہے کہ طلبا انھیں خریدتے وقت بار محسوس نہ کریں۔ قلیل مدت میں ایسی کتابوں کے متعدد ایڈیشن فروخت ہو جانا اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

زیر نظر کتاب کا یہ ایڈیشن اس امید کے ساتھ پیش ہے کہ طلبا و دیگر قارئین حسب سابق اسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

محمد شاہد اللہ خاں
چیرمین
مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
مارچ ۲۰۰۲ء

ترتیب

مقدمہ	۵
سورۂ رحمٰن	۱۱
فتنۂ خانقاہ	۱۴
جنگل کی شاہزادی	۱۷
جامن والیاں	۲۱
انگیٹھی	۲۳
فاختہ کی آواز	۲۶
شباب مرعوب شیب	۲۷
تو اگر واپس نہ آتی	۲۹
کون ؟	۳۲
شام کا رومان	۳۴
ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے	۳۶
غلاموں سے خطاب	۴۰
درد مشترک	۴۲
شکستِ زنداں کا خواب	۴۳
گرمی اور دیہاتی بازار	۴۵
البیلی صبح	۴۷
زندگی	۴۹
فریبِ ہستی	۵۲
نقاد	۵۳
مہاجن	۵۷
پردگرام	۵۹
مکالمہ صبح و شاعر	۶۰
جواب شاعر	۶۲
اعترافِ عجز	۶۴
کیا گل بدنی ہے	۷۳
میرا مرثیہ	۷۷
میرے بعد	۸۱
الوداع	۸۴
رباعیات	۸۹

مُقدمہ

شبیر حسن خان جوشؔ ملیح آبادی کی سانسوں کا سفر جو پانچویں دسمبر ۱۸۹۶ء کو ملیح آباد کے محلہ مرزا گنج کے ایک جاگیر دار گھرانے سے شروع ہوا تھا۔ ۲۲ ویں فروری ۱۹۸۲ء کو پاکستان کی راجدھانی اسلام آباد میں ختم ہو گیا۔ اور اپنے پیچھے ایک ایسی کہانی چھوڑ گیا جو اس وقت تک دہرائی جاتی رہے گی جب تک کہ اردو زبان و ادب زندہ ہے۔ بیان کرنے والا بیان کرتا رہے گا کہ ـــــ جوشؔ ملیح آبادی کے اجداد درۂ خیبر کے راستے وادیٔ تیراہ سے چل کر والیٔ فرخ آباد احمد خان بنگش کے یہاں قیام کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور ملیح آباد کے محلہ کنولہار میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جوشؔ کے پردادا حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویاؔ، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کی افواج میں اہم عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ اردو زبان و ادب کے گیسو سنوانے اور سلجھانے میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ "انوار سہیلی" کا اردو ترجمہ "بستان حکمت" اور "دیوان گویاؔ" ان کی یادگاریں ہیں۔ جوشؔ کے دادا محمد احمد خان احمدؔ اور والد بشیر احمد خان بشیرؔ بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ بزرگوں کی وہ تلوار جس کی آب بشیر احمد خاں تک آتے آتے اتر چکی تھی، جوشؔ نے قلم سے تبدیل کر لی۔ لیکن اس خیال کو فراموش نہیں کر سکے کہ ؎

اہلِ دنیا کی نظر میں محترم ہوتا نہیں
مَرد جب تک صاحب سیف و قلم ہوتا نہیں

سیف کا تصور جوش کے ذہن کو ماضی کی گرمی ضرور بخشتا رہا لیکن قلم نے ان کے سر پر عظمت اور شہرت کا ایسا تاج رکھ دیا جس کی چمک سے وہ بیسویں صدی کی اردو شاعری کے بلا شرکت غیرے تاجدار کہے جانے لگے اور اس قابل ہو گئے کہ اعلان کر سکیں ؎

ادب کر اس خرابات کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوش کی پیدائش ایک ایسے افغان گھرانے میں ہوئی تھی جسے شاندار ماضی سے وابستہ رہنے کا فخر حاصل تھا۔ یہاں طاقت فیصلوں پر حکمرانی کرتی تھی اسی لئے بشیر احمد خاں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شبیر حسن کو نہ تو شاعری کرنے دوں گا اور نہ اپنی نظروں سے دور کہیں تعلیم حاصل کرنے کیلئے جانے کی اجازت دوں گا۔ انھیں وجوہ کی بنا پر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود، جوش سیتاپور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرے کی درسگاہوں کے چکر کاٹتے رہے لیکن باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے، لیکن شبیر حسن خاں کے وجود میں ایک دوسرا سیماب، صفت، وجود، جوش بھی پروان چڑھ رہا تھا جسے فنا کرنے میں بشیر احمد خان کو کامیابی نہ مل سکی اور اس وجود نے ان کی زندگی میں ہی، سات برس کی عمر میں اقرار کیا کہ ؎

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فن خاندانی ہے

شاعری راس آئی تو حضرت عزیز لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی جس کا سلسلہ چھ برس تک جاری رہا اور پھر ۱۹۱۶ میں والد کے انتقال کے بعد مجسم پیکر اختیار کر کے ۱۹۲۱ میں "روح ادب" کے ذریعے سے اپنے بلند تر ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

۱۹۱۶ تک جوش ملیح آبادی کی زندگی ایک ایسے نوجوان کی زندگی رہی جسے ہر قسم کی آسودگی حاصل تھی لیکن والد کے انتقال کے فوراً بعد ان کی دلہن اشرف جہاں بیگم رخصت ہو کر گھر آ گئیں، جائداد تین بھائیوں میں تقسیم ہو گئی۔ آمدنی گھٹ گئی، جوش نے امانی گنج کے میدان میں "قصر سحر" کی تعمیر شروع کر دی اور ۱۹۲۰ میں وہیں سکونت بھی اختیار کر لی۔ چار برس تک لکھنؤ، آگرہ اور ملیح آباد میں ہاتھ پاؤں چلانے کے بعد حیدر آباد کا سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور علامہ اقبال کے سفارشی خط کے ساتھ سر کشن پرشاد سے ملاقات کی، جنھوں نے نظام سے سفارش کر کے "دارالترجمہ" میں "ناظر ادبی" کے منصب پر فائز کرا دیا۔ ۱۹۲۴ میں انہوں نے حیدر آباد چھوڑ دیا اور شمالی ہند چلے آئے۔

اس دوران رسائل نکالنے کے علاوہ مشاعروں میں شرکت اور مجموعوں کی اشاعت کا کام بھی جاری رہا، دوستوں اور مداحوں کی بھیڑ جمع ہو گئی، ہندوستان کی مقتدر ہستیاں عزت و احترام کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دینے لگیں۔ جوش کے بغیر مشاعرے سونے رہنے لگے۔ جہاں جاتے چھا جاتے، جس محفل میں شریک ہوتے ہزاروں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے۔

انہوں نے جنوری ۱۹۵۷ میں پاکستان کی شہریت حاصل کر لی۔

جوش ملیح آبادی، جیسے شاعر اپنے وقت کی آپ ہی آواز ہوتے ہیں وہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی اور عظیم شعری آواز تھے، وہ الفاظ کے جادوگر کہے گئے، نظم کے قافلہ سالار سمجھے گئے، شاعر انقلاب، شاعر جذبات، شاعر فطرت، شاعر شباب، شاعر اعظم اور شاعر رومان کے خطابات سے نوازے گئے۔

جوش اپنے پیچھے ـــــ روح ادب، فکر و نشاط، نقش و نگار، شعلہ و شبنم سنبل و سلاسل، عرش و فرش، سرود و خروش، حرف و حکایت، سموم و صبا

رامش ورنگ، آیات ونغمات، سیف وسبو، طلوع فکر، موجد ومفکر، جنون وحکمت الہام وافکار، نجوم وجواہر، حرف آخر اور یادوں کی برات کی شکل میں جو شعری اور نثری سرمایہ چھوڑا ہے اس کے مطالعے سے ان کے قد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جوشؔ کی شاعری کو لفاظی، خوشہ چینی، الفاظ کا گورکھ دھندا، سطحی یا غیر فکری کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بظاہر ان کی شاعری رومانی اور انقلابی فکر سے بوجھل نظر آتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک رومانی شاعر ہیں، چونکہ رومانی شاعری کا ایک توانا پہلو انقلاب بھی ہے اس لئے ہم انہیں "انقلابی" کے لقب سے بھی یاد کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر انقلاب کے مفہوم اور اسکے ضمن میں آنے والے دوسرے عناصر کو پیش نظر رکھا جائے تو جوشؔ انقلابی شاعر نہیں ہیں۔ انقلابی شاعر کی حیثیت سے ان کا قد اتنا بلند نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ رومانی شاعر کی حیثیت سے اونچا ہے۔

جوشؔ کی رومانی شاعری میں انقلاب فرانس کی وہ روح جاری ساری نظر آتی ہے جس نے ادبیات فرانس ہی کو نہیں بلکہ مغرب کے پورے شعری اور نثری سرمائے کو متاثر کیا ہے۔

رومانی فکر کی وہ خصوصیات جنہیں ہم، جوش، جذبے، وجدان، تخئیل، ماضی پرستی، وطن دوستی، فطرت پرستی، پرانی قدروں اور روایات سے بغاوت اور انقلاب جیسے ناموں سے جانتے ہیں۔ جوشؔ کے یہاں ایک مقدس امانت کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں نگارشات فطرت کا غلغلہ ہے عشق کے آتشکدوں کا دیدار ہے، زلف وکاکل کی اسیری ہے وطن کی رسماہٹیں ہیں، بستروں کے مہکتے ہوئے شباب ہیں، مفلسوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں اور ان تمام اجزا کے ملاپ سے جو شخصیت پروان چڑھی ہے اس کا احاطہ چند صفحات میں کرنا اتنا

ہی دشوار ہے جتنا کہ سمندر کو کوزے میں سمیٹنا۔

ہندوستان کی غلامی اور عوام کے معاشی حالات پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ حسن اور مزدوری، کسان، ضعیف، بھوکا ہندوستان، مفلس کی عید جیسی نظموں میں انسانیت کے درد کی نشاندہی کی گئی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے غلاموں سے خطاب، تلاشی، بغاوت، پیمانِ محکم، نازک اندامان کالج سے خطاب، آثارِ انقلاب، زوال جہانبانی اور شکست زنداں کا خواب وہ نظمیں ہیں جنکی موجودگی میں وہ شاعرِ انقلاب نہ ہوتے ہوئے بھی، شاعرِ انقلاب کے لقب سے یاد کیے جاتے رہیں گے۔

فطرت نگاری میں بھی جوش زندگی کے آخری ایام تک مسلسل ارتقائی منزلوں کو طے کرتے رہے ہیں۔ وہ فطرت کے پجاری ہیں جسے انھوں نے سیکڑوں رنگوں اور ناموں سے یاد کیا ہے۔ جھرنوں کی جھرجھراہٹ، دریاؤں کی روانی برسات کی دلفریبیاں، طلوع و غروب کے مناظر کا بیان ان کی سیکڑوں نظموں میں پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ساون کے مہینے، برسات کی چاندنی، موجِ باراں، برسات کی شفق، پہلی گھٹا، بہار کی دوپہر، بھیگی رات، برسات کی شام، بہار کا ترانہ، شام کی بزم آرائیاں، البیلی صبح، بدلی کا چاند، اور نغمۂ سحر وغیرہ نظمیں ان کی فطرت نگاری کی اعلیٰ مثال ہیں۔

زیرِ نظر انتخاب میں جو اترپردیش اردو اکادمی کی فرمائش پر کیا گیا، اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جوش ملیح آبادی کی نمائندہ شاعرانہ خصوصیات سامنے آجائیں۔ ہر نظم کے آخر میں اس کے ماخذ کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

عصمت ملیح آبادی

دسمبر ۱۹۸۲ء

سورۂ رحمٰن

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

یہ سحر کا حسن، یہ سیارگاں اور یہ فضا
یہ معطر باغ، یہ سبزہ، یہ کلیاں دل ربا
یہ بیاباں، یہ کھلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا
سوچ تو کیا کیا کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

خُلد میں حوریں تری مشتاق ہیں آنکھیں اٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور، جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اپنے مرکز سے نہ چل منہ پھیر کر بہرِ خدا
بھولتا ہے کوئی اپنی انتہا اور ابتدا
یاد ہے وہ دور بھی تجھ کو کہ جب تو خاک تھا
کس نے اپنی سانس سے تجھ کو منور کر دیا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جا بجا
نرم شاخیں جھومتی ہیں، رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں دل فریب و خوشنما
جس کا ہر ریشہ ہے قند و شہد میں ڈوبا ہوا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

پھول میں خوشبو بھری، جنگل کی بوٹی میں دوا
بحر سے موتی نکالے صاف روشن خوش نما
آگ سے شعلہ نکالا، ابر سے آبِ صفا
کس سے ہو سکتا ہے اس کی بخششوں کا حق ادا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

ہر نفس طوفان ہے، ہر سانس ہے اک زلزلہ
موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ
مضطرب ہر چیز ہے، جنبش میں ہے ارض و سما
ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

صبح کے شفاف تاروں سے برستی ہے ضیا
شام کو رنگِ شفق کرتا ہے اک محشر بپا
چودھویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا
جھوم کر برسات میں اٹھتی ہے متوالی گھٹا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

(افکار "بیادِ جوش" ۱۹۸۲ء ص ۱۲۲)

فتنۂ خانقاہ

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے خانقاہ
زاہد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں
جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اٹھنے لگا دھواں
ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ خلد حسن کا پروانہ ہو گیا

اس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں نہ پوچھ
نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ
رخ پر ہوائے شام کی گلباریاں نہ پوچھ
کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اس گلعذار کا
گویا نزولِ رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے
چوگاں کے خم میں گوئے دل و جاں لئے ہوئے
رخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لئے ہوئے
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے

آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لَو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ عشوۂ آہن گداز کی لہریں ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی
پیشیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی آئینے میں دمک رُخِ آئینہ ساز کی
آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر کاکلِ شبگوں کے دام میں موجیں شرابِ سُرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح، رُخِ لالہ فام میں چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق، کہ نمی تھی گلاب میں یا اوس موتیے پہ، شبِ ماہتاب میں
آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہات اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہات سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دعا سے جو وہ مشعلِ حرم کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم انگڑائی آ چلی، تو بہکنے لگے قدم

انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اٹھا کہ ترے ساتھ جائینگے — اے حسن تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلےٰ اٹھائیں گے — قربان گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے

کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تری بارگاہ میں

سورج کی طرح زہد کا ڈھلنے لگا غرور — پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور — رُخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرور

ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زہد سُرخ ہوئی اور گل گئی

پل بھر میں زلفِ لیلیٰ تمسکیں بگڑ گئی — دم بھر میں پارسائی کی بستی اُجڑ گئی
جس نے نظر اٹھائی نظر رُخ پہ گڑ گئی — گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی

طوفان آب و رنگ میں زہاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد حدودِ عشق خدا سے نکل گئے — انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ، حسن کی گرمی سے جل گئے — کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے

القصہ دین، کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بُت خانہ ہو گیا

(حرف و حکایت ص ۱۲)

جنگل کی شاہزادی

پیوست ہے جو دل میں، وہ تیر کھینچتا ہوں
اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہو رہا تھا

اک موجِ کیف پرور دل سے گزر رہی تھی
ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گل رخ، کافر، دراز مژگان
سیمیں بدن، پری رُخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو
سروِ چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو

گیسو کمند، مہوش، کافور فام، قاتل
نظارہ سوز، دل کش، سرمست شمعِ محفل

ابرو ہلال، مے گوں، جاں بخش، روح پرور
نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار، دلبر

آہو نگاہ، نورس، گلگوں، بہشت سیما یاقوت لب، صدف گوں، شیریں بلند بالا
غارت گرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

گلشن فروغ، کمسن، مخمور، ماہ پارہ "دلبر کہ در کفِ او موم است سنگ خارا"
ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو
صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نور دیدہ برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ
چہرے پہ رنگ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری ایمائے سینہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری
لو ہا پتانے والی جلووں کی ضوفشانی سکے مٹھانیوالی اٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسن مناسبت میں پالی ہوئی گلوں کے آغوش تربیت میں
حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں
حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں

چینِ ستم گری سے ناآشنا جبیں ہے میں کون ہوں، یہ اسکو معلوم ہی نہیں ہے
ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے رہ رہ کے اڑنے والی چادر سنبھالتی ہے
گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے
کچھ دیر تک تو میں نے اسکو بغور دیکھا غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دنیا
گاڑی سے پھر اتر کر اسکے قریب آیا طوفان بیخودی میں پھر یہ زباں سے نکلا
اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنت اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت
اے روحِ ضعف نازک، اے شمعِ بزم عالم اے صبحِ روئے خنداں، اے شامِ زلف برہم
اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی
قدرت کی انتہائی تخئیلِ دل ربائی

چشم و چراغِ صحرا، اے نورِ دشت وادی
رنگیں جمال دیوی، جنگل کی شاہزادی

بستی میں تو جو آئے اک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلہ ہو

زندانِ بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں
تسبیحِ شیخ الجھے توبہ کے عزم ٹوٹیں

نظروں سے اتقا کے رسمِ رواج اتریں
زہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں

آنکھیں ہوں اشک افشاں، نالے شرر فشاں ہوں
کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں

شہروں کے مہوشوں پر اک آسمان ٹوٹے
پژردہ تمدن عشووں کی نبض چھوٹے

اس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آہیں
جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں

تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں
ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں

تیری نظر کی زد سے ہو جائیں خستہ و گم
مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسم

امن و اماں کے رخ کو بے آب و رنگ کر دے
دنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کر دے

کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے
خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے

تصنیف ہوں ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے
ان انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا
اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

یہ بن، یہ گل، یہ چشمے، مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیرِ فرماں، یہ سب رقیب ہوتے

کیوں میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟
بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے

ہاں دے لبوں کو جنبش، اے سرمدی ترانے

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سنتا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دہائی

عشوہ جبیں پہ لیکر دل کی اُمنگ آیا
چہرے پہ خون دوڑا، آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اٹھائی زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا
چمکا دیا جہانے ہر نقشِ دل بری کو
دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو

سنکر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں
اسکی نگاہ مین بھی غلطاں ہوئیں زبانیں

شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہاتھ پھیرا
دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا
کچھ جسم کو چرایا، کچھ سانس کو سنبھالا
کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لیکے ڈالا
تاریک کرکے میری آنکھوں میں اک زمانہ
جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ
ہونے لگی روانہ ارماں نے سر جھکایا
دل کی مثال کا نپارہ رہ کے بن کا سایہ
بیہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی
اتنے میں رات لیکر قندیلِ ماہ نکلی

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

۱۹۲۲
(نقش ونگار ص ۲۵)

جامن والیاں

روحِ شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتی پتی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی

خارِ صحرا، فیضِ ابر و باد سے نکھرے ہوئے
خاکِ گلشن، موجِ رنگ و بو سے اترائی ہوئی

بہ رہی ہیں ندیاں، ساون کے نغموں کی طرح
گا رہی ہیں کوئلیں، موسم کی تڑپائی ہوئی

آ رہی ہیں ناز سے نوخیز جامن والیاں
انکھڑیوں میں اجنبیت، چال اٹھلائی ہوئی

عمر کے نشے سے کچھ کچھ نیند میں ڈوبی ہوئی
برق کی ہلچل سے کچھ کچھ ہوش میں آئی ہوئی

ابر میں لچکے ہوئے پودوں کا دست و پا میں لوچ
دھوپ کے تپتے ہوئے کھیتوں کی سنولائی ہوئی

پھر رہی ہیں تر بتر گلیوں میں سوتی جاگتی
منہ اندھیرے ہی سے بوچھاروں کی چونکائی ہوئی

دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سروں کی ٹوکری
ہاتھ انگڑائی کی صورت، آنکھ شرمائی ہوئی

ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں، یہ کالی جامنیں
ہائے یہ گلشن، یہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی

پائے نازک راہ کے پانی سے یہ بھیگے ہوئے
پنڈلیاں زورِ جوانی سے یہ بل کھائی ہوئی

ہائے یہ بھیجتی ہوئی نوعمر جامن والیاں
عاقبت اندیش دہقانوں کی سمجھائی ہوئی

یہ جھجک اٹھنا جوانوں کی نظر سے بار بار
یہ نگاہیں شہر کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی

ہائے یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
جوشؔ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

1925

(نقش و نگار ص ۲۳)

انگیٹھی

بچپن کی اے اداس انگیٹھی! خدا گواہ
کیا کہئے تجھ پہ آج پڑی کس طرح نگاہ
تو، اور خاک سرد پہ یوں مثلِ سوگوار
افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار

میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟
کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟

افسوس وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے
جاڑوں کی دل فریب وہ راتیں، وہ چہچہے
شعلوں سے تیرے، ہائے وہ اٹھتا ہوا دھواں
وہ قہقہوں کی گونج، وہ شیریں پہیلیاں

خوشبو وہ تیری آنچ کی، جاں بخش و دل نواز
وہ تیرگی میں رنگ ترا، دل میں جیسے راز
شعلے وہ سُرخ سُرخ، دلوں میں تلے ہوئے
وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے

شعلوں کے بار بار وہ انداز دل نشیں
دم بھر میں زرنگار تو دم بھر میں سُرمگیں

ڈوبی ہوئی حیات میں تیری وہ گرمیاں
وہ گرمیوں میں لطف کے قصوں کی نرمیاں

وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار
کلیوں کا کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار

وہ غنچگی کا عہد، وہ گل باریاں تری
اڑتی ہوئی ہوا میں وہ چنگاریاں تری

وہ نرم نرم جسم، وہ تیری حرارتیں
وہ ذمہ داریوں سے معرّا شرارتیں

وہ چھوکرے، ادب سے دَروں میں کھڑے ہوئے
دایاؔں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے

ملاؤں کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان
رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندنی کا پاندان

وہ تیرے گرد و پیش بصد شانِ افتخار
آواز پاندان کے کھلنے کی بار بار

شایانِ آفریں وہ خواتین کا شعار
شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار

وہ ہیکلیں گلوں میں، لبوں پر وہ لالیاں
ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں

وہ لونڈیوں کے رُخ پہ نشاں خاک دھول کے
جوڑے وہ اونچے اونچے، وہ موباف تول کے

وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھٹے ہوئے
رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے

وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار
پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار

ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں
اطلس کی سُرخ گوٹ پہ وہ سُرخ دھاریاں

وہ "ایک بادشاہ" کی بیٹی کا ذکر خیر
وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوق سیر

وہ مرحمت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات
وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

وہ اک عجیب شانِ طرب سے ملی ہوئی
شیریں حکایتوں میں سَرو لوتنکی راگنی

کیوں اب بھی یاد ہیں، وہ لڑکپن کے مزے؟
اے شمعِ خواب گاہِ فراغت جواب دے!

جن کو بھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب ان میں تجھکو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

۱۹۲۷

(نقش و نگار ص ۹۱)

فاختہ کی آواز

آج تو فاختہ کی نرم آواز
ہے کچھ اس طرح غرق سوز و گداز
جیسے پیری میں یاد طفلی آئے
جیسے جل جل کے شمع بجھ جائے
جیسے یعقوب غرق شیون ہیں
جیسے سیتا کی جستجو بن میں
شب کو جس طرح دل میں درد اٹھے
ہو گئی نو عروس کی جیسے
شام کو زیر سایۂ کہسار
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار
جیسے جو بر نہ آئی ہو وہ مراد
جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
پانی آنے لگے سفینے میں
جیسے سسرال میں کوئی لڑکی
دیکھ کر بدلیوں کو ساون کی

صبح پنگھٹ کی نیم کے نیچے
مائکے کی گھٹائیں یاد کر لے

(شعلہ و شبنم - ص - ۴۰۶)

شبابِ مرعوبِ شیب

اک پیر کے پاس کچھ بجھی سی
بیٹھی ہے خموش ایک لڑکی

احساس کا خلفشار رخ پر
پیری کے ادب کا بار رخ پر

خامی پہ نگاہِ پختہ کاری
غنچے پہ خزاں کا رعب طاری

پیری کے جھکے نڈھال کاندھے
دریائے طرب کا بند باندھے

طوفاں کی سحر، جمود کی رات
شعلے کی جبیں پہ برف کا ہات

افسردہ ہے دامِ جزو میں کل
پژمردہ ہے جیبِ خار میں گل

تخریب کے سائے میں ہے تعمیر
نظروں میں پڑی ہوئی ہے زنجیر

بے چین ہے حسن کی تب و تاب
کھلنے کے لئے کلی ہے بیتاب

سینے میں ہے محوِ پرفشانی
پیری سے بجھی ہوئی جوانی

عشوؤں کا ہو یہ سوگواری
عارض کے خطوط میں ہے جاری

حسنِ، آتشِ غم میں جل رہا ہے
کانٹوں پہ شباب چل رہا ہے

رہ رہ کے حواس کھو رہی ہے
اینٹھن سی رگوں میں ہو رہی ہے

اٹھنے کے لئے نظر ہے بیتاب
آنکھوں میں تڑپ رہے ہیں گرداب

بے چین ہے ذوقِ خود نمائی
ہچکل میں ہے خونِ دل ربائی

سینے میں امس سی ہو رہی ہے
بیدار ہے یوں کہ سو رہی ہے

کاکل کے مزاج پر خدارا
اسے شیب کی ریش! رحم فرما

دے اِذن کہ دام تو بچھا لے
شانوں پہ مچل کے لہر کھا لے

اربابِ نظر پہ وار کر لے
کونین کا دلِ شکار کر لے

(حرف و حکایت ص ۲۱)

تو اگر واپس نہ آتی

تو اگر واپس نہ آتی۔ بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

ہاتھ آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں
اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تندِ باراں، وہ خروشِ برق و رعد[1]
دفعتہً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا
وہ "اپالو"[2] کے کلیجے کی مچلتی "مان سون"
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنون
اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا یکبارگی

---

[1] "باد" اور "رعد" کا قافیہ میرے نزدیک درست ہے۔ [2] انڈیا گیٹ واقع بمبئی

(۲)

تو اگر واپس نہ آتی بحر ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمین ہلتی، ستارے کانپتے
موت، اور پھر موت تیری، الحفیظ والامان
ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں

(۳)

لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوشش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تو اور میں اور بحر و باراں کا خروش
اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۴)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتی تیں اور پپیہے کوکتے
نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے

رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم باہیں گلوں میں ڈال کر

کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم

وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

(آیات و نغمات ص ۵۹)

کون؟

موجِ دریا پہ چھا رہا ہے یہ کون
سیج پر رسما رہا ہے یہ کون

صبح پنگھٹ پہ ہو رہی ہے طلوع
رخ سے کاکل ہٹا رہا ہے یہ کون

ادھ کھلی انکھڑیوں کو مل مل کر
جوئے مل میں نہا رہا ہے یہ کون

بوجھل انفاس کے تلاطم سے
بے صدا جھنجھنا رہا ہے یہ کون

آنچ گویا ہوا میں زیر و زبر
نیند میں سنسنا رہا ہے یہ کون

سطحِ دریا پہ چاندنی جیسے
چونک کر مسکرا رہا ہے یہ کون

کروٹوں کے گرائے تکیوں کو
کسمسا کر اٹھا رہا ہے یہ کون

روئے ناشستہ کے دھندلکے میں
رس کی بوندیں گرا رہا ہے یہ کون

ایک انگڑائی سے دو عالم کو
راگنی میں جھلا رہا ہے یہ کون

نیند کی رو میں شمع کی مانند
صبح کو جھلملا رہا ہے یہ کون

شرم کی چمپئی کلائی میں
سبز چوڑی گھما رہا ہے یہ کون

دیر صبحِ بہار کی زنجیر
رنگِ رخ سے ہلا رہا ہے یہ کون

انکھڑیاں جلد جلد جھپکا کر
سُرخ ڈورے بجا رہا ہے یہ کون

کردگار مرے درد دل کو
صبح دم کھٹکھٹا رہا ہے یہ کون

تیغ دوشیزگی کے پانی سے
آگ دل میں لگا رہا ہے یہ کون

تہہ بہ تہہ کر کے بیچ کی انگلی
بند مٹھی بجا رہا ہے یہ کون

سو چکی ہے جو اک زمانے سے
اس خلش کو جگا رہا ہے یہ کون

مجھ سے مغرور و بد مزاج کا سر
اپنے در پر جھکا رہا ہے یہ کون

عقل قصر بے نیازی پر
ناز کے گھن چلا رہا ہے یہ کون

میری دانش وری کے لوہے کو
تاب رُخ سے گلا رہا ہے یہ کون

مجھ میں اک گونہ بے رخی پا کر
خودکشی سے ڈرا رہا ہے یہ کون

جوشؔ میرے کھنڈر کو از سر نو
راج دھانی بنا رہا ہے یہ کون

(غیر مطبوعہ)

شام کا رومان

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے
فضائے نرم پر جس وقت چھا جاتا ہے سناٹا
مجھے جنبش میں ذروں کی زباں معلوم ہوتی ہے
سنکتی ہے مزے سے جب گھنے جنگل کے سائے میں
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے
بلند و پست و آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتا
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے
ٹپک پڑتا ہے جب خورشید آنسو بن کے گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے
دلِ وادی سے اٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سر گراں معلوم ہوتی ہے
چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے روحِ عالم بدگماں معلوم ہوتی ہے

جھلک اٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پر
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اُداسی کا رواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جس کو جگ بیتا
مرے دکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

اندھیرے میں لبِ ساحل جو پتے کھڑکھڑاتے ہیں
مجھے گیرائیِ فصلِ خزاں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائیگاں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ زریں میں
مجھے بیتائیِ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

دیا کچھ فاصلے پر ٹمٹما اٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی روشنی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

ریتیلی ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

(سیف و سبو ص۔۵۱)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

کس زباں سے کہہ رہے ہو، آج تم سوداگرو
"دھر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"
"جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا"
"بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا"
"باغ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں"
"آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں"
"ہاتھ سے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر"
"تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
ہجرتِ سلطان دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیرِ دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے؟
یاد تو ہو گی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہو گا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ

آج تک رنگون میں اک قبر ہے جسکی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابند ہے؟
"ڈائر" گرگ دہن آلود اب بھی زندہ ہے؟
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اہل آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا
آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں؟
اہل قوت، دام حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینگی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہل حق روشن نظر ہیں، اہل باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزل قوت میں تم رہتے نہیں
"جسکی لاٹھی اسکی بھینس" اب کس لئے کہتے نہیں؟

کیا کہا "انصاف ہے انساں کا فرض اولیں"
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدانا کردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں؟
گونج ہاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے، اسپ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کیا طبیعت کچھ نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے؟
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؓ
خیر، اے سوداگرو، اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے، اب فرمان ٹل سکتا نہیں

۱۹۳۹

(اوکار، جوش نمبر ص ۴۵)

غلاموں سے خطاب

اے ہند کے ذلیل غلامانِ رُسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیئے نگاہ

اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے
توپیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے

اے امتِ شکستہ دل والے گروہِ مثل
کب سے بلا رہا ہوں میں تجکو سوئے عمل

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر

حالانکہ میرا شعر ہے وہ حرفِ تند و تیز
طوفاں بدوش و صاعقہ پیمان و حشر خیز

ضد پر جو آئے بات میں پتھر کو توڑ دے
صرف اک صدا سے گنبدِ بے در کو توڑ دے

چاہے تو زہر سے اڑنے لگیں شرار
گلبرگ تر کے بطن سے پیدا ہو ذوالفقار

اکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاجِ سنگ

خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ

آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب

تجکو یقین نہ آئے گا اے دائمی غلام!
قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں

میرے رجز سے لرزہ براندام ہے زمیں
افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں

تو چپ رہا، زمیں ہلی، آسماں ہلا
تجھ سے تو کیا، خدا سے کہوں گا میں یہ گلا

ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں؟
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟

(شعلہ و شبنم ص ۳)

دردِ مشترک

سنتے ہیں طوفان میں ڈوبا ہوا تھا اک درخت
جس کی چوٹی پر ڈرے بیٹھے تھے دو آشفتہ بخت

ایک ان میں سانپ تھا اور ایک سہما نوجواں
دو ضدوں کا ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں

سچ ہے درد مشترک میں ہے وہ روحِ اتحاد
عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عناد

لیکن اے عاقل مسلمانو، مدبر ہندوؤ!
ہند کے سیلاب میں اک شاخ پر تم بھی تو ہو

(شعلہ و شبنم۔ ص ۹۶)

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں چھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو

اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی ہمکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں، دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

(شعلہ و شبنم۔ ص۔ ۵۱)

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دن گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لُو کا زور
آگ کی زد، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرے، گرم جھونکے آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لُو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں گرمی کی رو
کملیوں پر سُرخ چادل، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذروں کے شدائد، جھکڑوں کی سختیاں
جھکڑوں میں کھانستے بوڑھونکی چلموں کا دھواں

ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے، پیاس کے پالے ہوئے

بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہر نفس اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے

مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو پر چنے بھنتے ہوئے

میان سے موسم کی تیغ [illegible]
پیاس سے انساں و حیواں کی زباں نکلی ہوئی

لُو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی

یوں شعاعیں۔ سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی

آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم

ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی

سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح بر عکسِ گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سُود خواروں کی نگاہ

۱۹۲۶
(شعلہ و شبنم ص۔۵۹)

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی، جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیورِ بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی، رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی۔ لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک نیکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سُرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے
فلک پہ اِس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر، چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

(شعلہ و شبنم۔ ص ۳۶)

زندگی

اٹھ کہ حریمِ کیف میں عطر چکاں ہے زندگی
عطر چکاں و گل فشاں، رقص کناں ہے زندگی
صبح برخ، سمن بکف، شام بدوش، نے بلب
زہرہ جمال و نجم ادا، ماہ نشاں ہے زندگی
جنگ میں تازیانۂ دست و جنوں و برہمی
امن میں کارخانۂ شیشہ گراں ہے زندگی
رنگِ چنار کی قسم لعلِ نگار کی قسم
ابرِ بہار کی قسم، مرگِ خزاں ہے زندگی
طاق ہر ایک داؤں پر۔ کفشِ زمانہ پاؤں میں
کوہِ اجل کی چھاؤں میں، دجلۂ جاں ہے زندگی
دخترِ مہہ وشِ زمیں، لیلیٰ آسماں نشیں
جس پہ نثار سو یقیں، ہاں وہ گماں ہے زندگی
رقصِ شرر ہے رزم میں، لرزشِ کاہ بزم میں
پھر بھی محلِ عزم میں، کوہِ گراں ہے زندگی
بہرِ بقائے معتبر، بے پس و پیش و بے خطر

سینۂ دیو مرگ پر، نوکِ سناں ہے زندگی
نطق کے اشتیاق میں، حرف کے نورِ واق میں
ذوقِ بیاں کے طاق میں، شمعِ زباں ہے زندگی
گرد و غبار چار سو، دود و بخار مو بمو
پھر بھی بہ فیضِ شست و شو، نور فشاں ہے زندگی
طرۂ زلفِ مہ وشاں، تابِ عذارِ گل رُخاں
تاجِ محل ہے یہ جہاں، شاہِ جہاں ہے زندگی
راہ میں گرگ و مار ہیں، خار ہیں، شعلہ زار ہیں
غار ہیں، کوہسار ہیں، پھر بھی دواں ہے زندگی
عرصۂ گیر و دار میں، حلقۂ برق و نار میں
دوزخِ روزگار میں، باغِ جناں ہے زندگی
موت ہے پشت پر دواں، پھر بھی بسعیٔ بے کراں
جانبِ عمرِ جاوداں، گرمِ تکاں ہے زندگی
خستۂ جورِ این و آں، بستۂ مرگِ ناگہاں
پھر بھی شگفتہ و جواں زمزمہ خواں ہے زندگی
ہر بُنِ مو میں اک جہاں، ہر خمِ لب میں داستاں
شارحِ مصحفِ زماں، ناقدِ جاں ہے زندگی
فرشِ تعینات پر، عرشِ صفات و ذات پر
شمسۂ کائنات پر، کاہکشاں ہے زندگی
جامہ بجامہ، بر بہر، خانہ بخانہ، در بدر
خیر بخیر، شر بشر، سرِّ نہاں ہے زندگی

کوچہ بکوچہ، رہ برہ، مہر بمہر، مہ بمہ
قعر بقعر، تہ بتہ، شعلہ چکاں ہے زندگی

موج بموج، تب بتب، روز بروز، شب بشب
نطق بنطق، لب بلب، حرف بیاں ہے زندگی

آب بآب، گل بگل، نور بنور، ظل بظل
سینہ بسینہ، دل بدل، تاب و تواں ہے زندگی

مدح بمدح، دم بدم، پیچ بپیچ، خم بخم
دجلہ بدجلہ، یم بیم، تند عناں ہے زندگی

کوہ بکوہ، جو بجو، قریہ بقریہ کو بکو
رنگ برنگ و بو بو، موج دواں ہے زندگی

جزو بجزو، گل بگل، خار بخار، گل بگل
شیشہ بشیشہ، مل بمل، باد فشاں ہے زندگی

نوش بنوش، سم بسم، جرعہ بجرعہ، دم بدم
جام بجام، جم بجم، پیر مغاں ہے زندگی

جوش کا دم ہے واپسیں، لا بھی شراب و ساقیں
دیر نہ کر کہ ہم نشیں آب رواں ہے زندگی

(الہام و افکار۔ ص ۱۹۲)

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی
کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گل نہ رہنے پائے

مٹا کے نقشِ دوئی، صید رنگ و بو کیلئے
مہین جال سے بن کر زمیں کی تہ میں بچھائے

کثافتوں میں لطافت کی شمع روشن کی
نمو کے ظلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے

گھٹا کی جیب تراشی، فضا پہ ڈالے دام
قدم پہ شمس کے تڑپی، قمر کے ناز اٹھائے

گذشتہ زہرہ جبینوں کے دل نشیں ذرات
نفس کی لَو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے

دیئے گئے تھے نباتات کو جو رازِ ازل
کمالِ حسن و لطافت سے وہ سبق دہرائے

جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک
جمودِ زیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے

تری زمین سے لی، آسمان سے گرمی
صبا سے عطر نچوڑا، کرن سے رنگ چرائے

بھگو کے رنگ میں ذرات کی نبائیں تہیں
اور ان تہوں میں تکلف کیساتھ نقش بٹھائے

گرہ لگائی پھر اک مثلِ نرگسِ مخمور
اور اس طرح کہ ہواؤں کی رو میں کھلتی جائے

(فکر و نشاط۔ ص ۱۸)

نقاد

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتلِ عام
برشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!

کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کیلئے
کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کیلئے

اے ادب ناآشنا، یہ بھی نہیں تجھکو خیال
تنگ ہیں، بزمِ سخن میں مدرسے کے قیل و قال

منطقی کانٹے پہ رکھنا ہے کلامِ دل پذیر
کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر

یعنی اک لَے سے لبِ ناقد کو کھلنا چاہیئے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیئے

شعر فہمی کے لئے ہیں جو شرائط بے خبر
سوچ تو پورا اُترنا بھی ہے اس معیار پر؟

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تو نے داغ
آنچ سے جسکی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ؟

دل سے اپنے پوچھ او زندانیٔ علمِ کتاب
حسنِ قدرت کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب؟

تو پتا اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی؟

کیا وہاں بھی اڑ کے پہنچا ہے کبھی اے نکتہ چیں
کانپتا ہے جس فضا میں شہپرِ روح الامیں؟

خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دھنتا ہے تو
قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے؟

ان بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب؟ خاک کو پرچھائیاں جنکی بناتی ہیں گلاب
جو بسم چھین لیتے ہیں شب مہتاب سے جنکی برنائی جگاتی ہے دلوں کو خواب سے
سچ بتا تو بھی ہے کیا، اے کشتۂ صد حرص و آز رازدان کاکل شبرنگ و چشم نیم باز؟
تیری نبضوں میں بھی تجلی ہے کبھی بجلی کی رو سوزِ غم سے تیرا دل بھی کیا کبھی دیتا ہے لو؟

سچ بتا، اے عاشقِ دیرینۂ فکر معاش
زہر میں تریاق کے عنصر کی بھی کی ہے تلاش

مجھ سے آنکھیں تو ملا اے دشمنِ سوز و گداز تجھ پہ کیا اضداد کی توحید کا افشا ہے راز؟
تیری راتوں کی سیاہی میں بھی اے ظلمتِ مآب کیا کبھی طالع ہوا ہے مسکرا کر آفتاب؟
تو گیا بھی ہے نگارِ غم کی محفل کے قریب آنچ سی محسوس ہوتی ہے کبھی دل کے قریب؟
طورِ معنی پر بھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟

یہ نہیں تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے، شاعر کی دنیا اور ہے

شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سن خود زبانِ شعر سے، اشعر کی تفسیر سن
دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بیشمار نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیبِ ادب ڈھل کے گوہر "گوہرِ غلطاں" کا پاتی ہے لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخش تاجِ زرفشاں پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں

جن کے اسرارِ درخشاں روح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں، موتی دل میں ہیں

شاعروں کا خانماں ہے نطق کا لوٹا ہوا اسکا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سرشار پر ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لب گفتار پر
جاگتے رہتے ہیں دل کی محفلِ خاموش میں بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی آغوش میں

لوگ جنکی جاں گدازی سے ہیں دل پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال
جام میں آتے ہی اُڑ جاتی ہے شاعر کی شراب
ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب
اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
شعر کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام
"مشتبہ" سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام
کیف میں اک "لغزشِ پا" کلکِ گوہر بار کی
"اضطراری ایک جنبش سی" لبِ گفتار کی
"ایک صوتِ خستہ و موہوم سازِ ذوق کی"
"مرتعش سی ایک آواز" انتہائے شوق کی
"بے حقیقت نے" کے اندر زمزمہ داؤد کا
"عارضِ محدود" پر اک عکس "لامحدود" کا
"شعر کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال"
"شعر کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال"
ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرات کی
جوئے قدرت کی روانی، دشتِ مضوعات میں
ٹوٹنا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں
شعر کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دلنشیں
شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقیں

شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا
ترزبانی اور خاموشی کی پیہم گفتگو
لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو
بادلوں سے ماہِ نو کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا قطرے کے روزن سے عروسِ بحر کا

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں　　عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں
تو سمجھتا تھا جو کہنا چاہئے تھا کہہ گیا　　پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا
کون سمجھے "شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

(فکر و نشاط ص۔ ۷۰)

مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی
سر پہ چٹیا، مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی

دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار
ناک میں مونچھوں کے گوشے، پیٹ میں توندی کا غار

سامنے غلّے کے بورے، پشت پر الماریاں
بغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں

کہنیاں تکیے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی
چست صدری دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی

خوب لے لے کر ڈکاریں دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پھلائے توند سہلاتا ہوا

ہنس کے غوطے، آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا

عُذر کرتا پے بہ پے تیوری چڑھاتا بار بار
شدّتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار

کشتیٔ ہستی کو جوئے سیم میں کھیتا ہوا
الٹی سانسیں فربہی کے بار سے لیتا ہوا

رخ کی تازگی پہ زر کی سرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک ۔ سونا بن کے اترائی ہوئی

کان کے بالے نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

(آیات و نغمات ص ۔ ۲۲۵)

پروگرام

اے شخص! اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمتِ کدہ بادہ فروشاں میں ملے گا

اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

۱۹۳۳

(نقش و نگار ص۔ ۶۵)

مکالمۂ صبح و شاعر

(صبح)

کہتا تھا خود کو "نامِ خدا" تو خدا پرست
اب میری بارگاہ میں آتا نہیں ہے جوش
جس جھٹپٹے نے تجکو سکھائے تھے زمزمے
اس جھٹپٹے میں اب کبھی گاتا نہیں ہے جوش
کلیاں چٹک کے پھول بنیں، پھول ہنس پڑیں
اب اس روش سے باغ میں آتا نہیں ہے جوش
میری بہشتِ حسن میں اپنی زبان سے
دریا لطافتوں کے بہاتا نہیں ہے جوش
آہستہ سے ہٹا کے دھندلکے کی شبنمی
اب میرے فرشِ خاک تک آتا نہیں ہے جوش
یہ طرفہ سانحہ ہے کہ اب ایک عمر سے
پہلی کرن کا تار بجاتا نہیں ہے جوش
بانگِ طیور و جنبشِ بالِ نسیم سے

شبنمی

اب کیا ہوا کہ ہوش میں آتا نہیں ہے جوشؔ
اس طاق میں کہ جس میں جلاتا تھا شمعِ دل
اب دل تو کیا چراغ جلاتا نہیں ہے جوشؔ
چلتی ہے جب نسیم، مچلتی ہیں ڈالیاں
پودوں کو اب گلے سے لگاتا نہیں ہے جوشؔ
حافظؔ کے شعر پڑھ کے مری بارگاہ میں
اب منہ اندھیرے عود جلاتا نہیں ہے جوشؔ
زانو پہ فرقِ ماہ کو رکھ کر خیال میں
اب میری چاندنی کو سلاتا نہیں ہے جوشؔ
گردوں پہ دیکھتے ہی مرا نقرئی جلوس
میدان میں جھومتا ہوا آتا نہیں ہے جوشؔ
تاروں کی انکھڑیوں میں ہیں آنسو بھرے ہوئے
پچھلے پہر اب اشک بہاتا نہیں ہے جوشؔ

جوابِ شاعر

شکوے ترے درست مگر اے نگارِ صبح
اب جوش بزمِ ناز میں آئے تو کس طرح
پھنکار رہے جو آتشِ غم سے تمام رات
وہ منہ اندھیرے عود جلائے تو کس طرح
ہر آن آہِ سرد سے ہو جس کا سابقہ
موجِ صبا سے وجد میں آئے تو کس طرح
جس پر کثافتیں ہوں غمِ روزگار کی
دریا لطافتوں کے بہائے تو کس طرح
دنیا میں جس کا نوحہ بھی سنتا نہ ہو کوئی
وہ بدنصیب شعر سنائے تو کس طرح
طغیانِ تیرگی میں جسے سوجھتا نہیں
وہ طاقِ زر میں شمع جلائے تو کس طرح
بنتِ عنب کے ساتھ جو جاگا ہو دیر تک

تکیئے سے جلد سر وہ اٹھائے تو کس طرح
وہ آفتاب، رات گئے جو غروب ہو
قبل طلوع جلوہ دکھائے تو کس طرح
آتش کی لوریوں سے سُلایا گیا جو ہو
ایسے کو آبِ چرخ جگائے تو کس طرح
جس کے جگر میں ہوں غمِ دوشیں کی برچھیاں
پہلی کرن کا تار بجائے تو کس طرح
پہلو اُجڑ چکا ہو جس آفت رسیدہ کا
زانو پہ چاندنی کو سلائے تو کس طرح
گونجی ہوئی ہو جس کی رگ و پے میں ہائے ہائے
دھومیں تری فضا میں مچائے تو کس طرح
جو خشک آنسوؤں سے پیئے رات کو شراب
پچھلے پہر وہ اشک بہائے تو کس طرح

(۱۹۴۰)

(عرش و فرش ۔ ص ۴۳)

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
صدرِ معنی، داورِ الفاظ، امیرِ شاعراں
اور خود میرا بھی کل تک، خیر سے تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں من جملۂ اہلِ کمال

لیکن اب آئی ہے جب اک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی
آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں

جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
اتنی لامحدود دنیا، اور میری شاعری
الاماں آفاق کا دل اور یہ طوفانِ سوز
اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں کہنہ ہنوز

زلفِ ہستی اور اتنے بے نہایت پیچ و خم
اڑ گیا رنگِ تعلّی، کھل گیا اپنا بھرم
میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے

کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال
اک اچٹتا سا جمال، اک سر بہ زانو سا جلال
میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
ایک طفلانہ بلوغ، اک کھوکھلا سنِ شعور

میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام
ایک دردانگیز درماں، اک شکست آمادہ جام
گاہ سوزِ چشم و ابرو، گاہ سازِ ناؤنوش
گاہ خلوت کی خموشی، گاہ جلوت کا خروش

چھپے کچھ موسموں کے، زمزمے کچھ جام کے
دیرِ دل میں چند مکھڑے مرمریں اصنام کے
چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیردارانہ، بقولِ ناقداں
بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں
وصل کے دو چار قصے، ہجر کی اک آدھ آہ
قصر سے ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ

گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی امنگ
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ
اتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
اتنی عبرت ناک سطحیت پہ اتراتا تھا میں

بے خبر تھا میں کہ دنیا، راز اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
جو یہاں اظہر من الشمس و چراغِ طور ہے
وہ درخشاں چیز بھی اک حلقۂ بے نور ہے

یہ سہانا بوستاں سرو و گلو و شمشاد کا

ایک پل بھر کا کھلنڈرا پن ہے ابر و باد کا
ہر ترنم ہے دلِ خوں بستہ کی اک موجِ زہر
ہر تبسم ہے خراشِ سینہ کی ہلکی سی لہر

شرم، شوخی کی تھکاوٹ، عشوہ، عجز دل بری
ناز اک رنگیں سہارا، ناز کی اک لاغری
بوئے گل کیا، ایک عیارانہ شوخی گرد کی
زمزمے کیا ایک خوش فعلی ہے آہِ سرد کی

برق، بینائی پہ ایک ضربِ سحابِ تیرگی
شعلہ، جوالہ، قرطاسِ کتابِ نیرگی
اس محلِ آب و گل میں یہ حیاتِ آدمی
گربہ کی صرف ایک پل بھر موش سے بازی گری

ابتدا و انتہا کا علم، نظروں سے نہاں
ٹمٹماتا سا دیا دو ظلمتوں کے درمیاں
جہل کا اک قہقہہ ہر ادّعائے آگہی
موت کا اک مسخرا پن ماجرائے زندگی

روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا
تہہ بہ تہہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما

انجمن میں تخلیے ہیں، تخلیوں میں انجمن
ہر شکن میں اک کھچاوٹ، ہر کھچاوٹ میں شکن

عام سمولاتِ دنیا، واقعاتِ صبح و شام
فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں
ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں

روشن امیدوں کی پیشانی میں غلطاں ابرِ بیم
ہم سوادِ گیسوئے پرخم، صراطِ مستقیم
ایک اک گوشے سے پیدا، وسعتِ کون و مکاں
ایک اک خوشے میں پنہاں صد بہارِ جاوداں

جنگ میں پیغامِ رحمت، سنگ میں پیکِ بہار
پرنیاں میں تیغ کی باڑھ، آب میں آہن کی دھار
لیلیٔ سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف
برف میں شعلے تپاں، شعلوں کی طراری میں برف

تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نکات
خاک کی چٹکی میں پرافشاں قوائے کائنات
ہر کرن اک ابر، ہر [illegible]

ہر سحر اک ریو شب، ہر جلوہ اک بکرِ حجاب

ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریب ابصار کا
ہر گلِ شاداب، اک بہر و پیاپن خار کا!
ہر خزف الماس، ہر زنجیر تارِ عنکبوت
ہر کلید اک قفل، ہر جھنکار اک جولاں سکوت

پیکرِ ہستی پہ ڈھیلا ہے مظاہر کا لباس
اور ہیں اس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس
برق کی لہروں کی وسعت، الحفیظ و الاماں
نور میں صرف ایک کوندے کی لپک کا رازداں

رازداں کیا مدح خواں، اور مدح خواں بھی کم سواد
نابلد، نادان، ناواقف، ندیدہ، نامراد
خارج از وہم و گماں ہے عمر لیلائے زمیں
اور اک لمحے کی پیمائش پہ میں قادر نہیں

کیوں نہ پھر سمجھوں، سبک اپنے سخن کے رنگ کو
نطق کے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو
لیلیٰ آفاق الٹتی ہی رہی پیہم نقاب
صہبا، انقلاب

دائمی قدروں کی ہر ساعت گہر پاشی رہی
اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیاشی رہی
غرفہ ہائے لعل و گوہر، آسماں کھولا کیا
اور میں رندِ سیہ رو، کوئیلے تو لا کیا!

پار باہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیوں کہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات
کائنات اک کارگاہِ سطوتِ و کاخِ جلال
جلوہ گر جسکے نقائص میں بھی روحِ صد کمال

یہ بھنچی، الجھی زمیں، یہ پیچ در پیچ آسماں
الامان والامان والامان والامان
ایک منا سا ستارہ ایک ننھا سا شرار
یہ تنزل، یہ تلاطم، یہ تموج یہ فشار!

اک نفس کا تار اور پر شورِ عمرِ جاوداں
اک کڑی اور اس میں زنجیروں کے اتنے کارواں
اک تبسم اور اتنے خونِ صالح کے نجوم
ایک مبہم نقش اور اتنی شعاعوں کا ہجوم

ایک ایک لمحے میں اتنے کاروانِ انقلاب
ایک اک ذرے میں اتنے ماہتاب و آفتاب
یہ گرج، یہ برق، یہ طوفاں، یہ صرصر، یہ سموم
بندگانِ چند اور اتنے خداؤں کا ہجوم

لَے کی جنبش اور اتنے حلقہ ہائے بے شمار
نَے کی کروٹ اور یہ ہنگامۂ رقصِ شرار
اک صدا اور اس میں یہ لاکھوں ہوائی دائرے
جسکے شعبوں کو اگر چن لے تو دنیا گونج اٹھے

ایک پرتو اور فضائے بے کراں پر جست و خیز
اک دیا اور آندھیوں کی فوج سے گرمِ ستیز
ایک بوند اور ہفت قلزم کے ہلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب اور تعبیر کا اتنا خروش!

کوہ کی رفعت میں اتنی پستیوں کے خط و خال
کاہ اور اتنے عناصر کے مساعی کا مآل!
اک ہیولیٰ اور یہ اشکال و اسمار کا ہجوم
جہلِ مطلق کے سیہ خانے میں یہ رقصِ علوم

بہرِ یک ساعت، پرائے تابشِ یک بامداد

اتنی سعیٔ آب آتش، اتنی جہدِ برق و باد
ایک شبنم اور اتنے تند شعلوں کی ترنگ
ایک حرف اور اتنے پہلو، اک نظر اور اتنے رنگ
اک کلی اور اس میں صدیوں کی متاعِ رنگ و بو
صرف اک لمحے کی رگ میں اور قرنوں کا لہو!

ہر قدم پر نصب اور اسرار کے اتنے خیام
اور اس منزل میں میری شاعری، میرا کلام!
جس میں رازِ آسماں ہے، اور نہ اسرارِ زمیں
ایک خس، اک دانہ، اک جو، ایک ذرہ بھی نہیں
نوعِ انسانی کو جب مل جائے گی رفتارِ نور
شاعرِ اعظم کا تب ہوگا کہیں جا کر ظہور
خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی
جھاڑ دے گی موت کو دامن سے جس دن زندگی

جب قوائے بحر و بر پر آدمی ہوگا سوار
جب بنے گا بندہ مجبور الٰہِ روزگار
جب ہماری جوتیوں کی گرد ہوگی کہکشاں
تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں
فکر میں کامل نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

(۱۹۵۰)

(سموم و صبا۔ ص ۱۱۹)

کیا گل بدنی ہے

کس درجہ فسوں کار وہ اللہ غنی ہے کیا موجۂ تابندگی و سیم تنی ہے
انداز ہے یا جذبۂ گردوں زدنی ہے آواز ہے یا بربطِ ایماں شکنی ہے
جنگل کی سیہ رات ہے یا زلف گھنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

یہ لے ہے کہ کھلتی ہوئی غنچے کی کمانی مہکا ہوا یہ تن ہے کہ یہ رات کی رانی
لہجے کی یہ رَو ہے کہ برستا ہوا پانی لرزش میں یہ مژگاں ہے کہ پرنوں کی کہانی
یہ سرخیٔ لب ہے کہ عقیقِ یمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

محراب ہے رخسار کے پرتو سے زرافشاں زلفوں میں شب تار ہے آنکھوں میں چراغاں
مہندی کی سجاوٹ کہ ہتھیلی پہ گلستاں یا حلقۂ عشاق میں ہے چہرۂ تاباں
یا خاتمِ تابندہ پہ ہیرے کی کنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

سینے پہ یہ ہے کہ اک موجِ حبابی ماتھا ہے کہ اک صبح کا پرتو ہے شہابی
آنکھیں ہیں کہ بہکے ہوئے دو مست شرابی پیکر ہے کہ انسان کے سانچے میں گلابی
گیسو ہیں کہ گل بازیٔ مشکِ ختنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

کاکل میں درخشاں ہے یہ پیشانیٔ رقصاں یا سایۂ ظلمات میں ہے چشمۂ حیواں
ہاتھوں پہ یہ چہرہ ہے کہ ہے رحل پہ قرآں اور چہرۂ گل رنگ میں غلطاں و خروشاں
رخشندگیٔ خونِ رگِ یاسمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے چھل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے مکھڑا ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
قامت ہے کہ برنائیٔ سروِ چمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

تن میں ہے وہ خوشبو کہ ہیں گل سر بگریباں چہرے پہ وہ سرخی ہے کہ حیران گلستاں
وہ چال میں ہے لوچ کہ شاخیں ہیں پشیماں اور لعل گہر بار پہ وہ نغمہ ہے غلطاں

وہ نغمہ کہ اک ولولۂ شعلہ زنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

گردن میں چندن ہار ہے، ہاتھوں میں ہے کنگن اڈے ہوئے عشوے ہیں گرجتا ہوا جوبن
جولاں ہے جوانی کے دھندلکے میں لڑکپن کوراہے جو پنڈا تو جنوں خیز ہے ابٹن
گل رنگ شلوکا ہے قبا نارونی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

خلوت میں وہ تسلیم ہے، جلوت میں تحکم ساحل پہ سبک موج سفینے میں تلاطم
حجرے میں خموشی ہے، شبستاں میں تکلم خیمے میں تنک آہ، خیاباں میں ترنم
آغوش میں تلوار ہے، گھونگھٹ میں بنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

ہر نقشِ قدم پر ہے فدا تاجِ کیانی ہر گام میں ہے چشمۂ کوثر کی روانی
ہر ایک بنِ مو سے ابلتی ہے جوانی اٹھتی ہے مسامات سے یوں بھاپ سی دھانی
گویا کوئی مہکی ہوئی چادر سی تنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

آنکھوں میں ہے یہ کفر کہ ایمان ہے میرا عارض پہ ہے یہ خال کہ حوروں کا ہے ڈیرا
پلکوں کی ہے یہ چھاؤں یہ مستی کا سویرا رخ پر یہ لٹیں ہیں کہ دھواں دھار سویرا
قامت پہ یہ یہ مکھڑا ہے کہ نیزے پہ انی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

جسطرح دھندلکے میں ہو اک رنگ سا غلطاں جیسے کہ سحر کنج میں آہستہ خراماں
جسطرح اڑے بام پہ بلقیس کا داماں جیسے کہ دھواں عود کا مندر میں پریشاں
رخسار پہ یوں صبح کی اعضا شکنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

اس سن مین بھی پڑتی ہیں حسینوں پہ نگاہیں
قدموں کے تلے اب بھی جوانی کی ہیں راہیں
اب بھی یہ تمنا ہے ملیں پھول سی باہیں
اصنام کو ممکن ہے کہ ہم جوش نہ چاہیں

گھٹی میں بڑی عاشقی و برہمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

(افکار جوش نمبر - ص ۴۸۲)

میرا مرثیہ

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے
ہنسایا جب تو رونے کو ہنسایا

ارے اس عالمِ تعجیل خو نے
یہاں مجھ کو بہت پہلے بلایا

جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھ کو
وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا

مجھے گونگوں کی محفل میں جگہ دی
مجھے سوتوں کے حجرے میں جگایا

مجھے دیوؤں کے جنگل میں اتارا
مجھے بھوتوں کے کنڈل میں بسایا

مجھے بونوں کے پہلو میں جگہ دی
مجھے مُردوں کی ارتھی پر بٹھایا

مجھے اوہام کی بھٹی میں جھونکا
مجھے اقوال کی لَو پر جلایا

مجھے اندھوں کی محفل میں سنوارا
مجھے بہروں کے حلقے میں بجایا

جہاں فکرِ جواں اگتی نہیں ہے
مرا اس خاک پر پودا اُگایا

ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا
کمر میرے تجسس کی جھکا دی گلا میرے تفکر کا دبایا
مرے افکار پر کی سنگ باری اور اتنی کوئی پھل رہنے نہ پایا
مرے اشعار جھنڈے پر چڑھائے مرے افکار کو نکو ـــــ بنایا
ہر اک سقراط آنکھیں بند کر کے مری نادانیوں پر مسکرایا
اکٹھا ہو گئے جب چند بقراط اشاروں سے مجھے گھامڑ بنایا

میں تھا بھی شاید اک ایسا معمہ
کہ یاروں کی سمجھ میں ہی نہ آیا

ستا سکتی نہیں اتنا اجل بھی مجھے اس عمر نے جتنا ستایا
اٹھائی خود ہی میں نے لاش اپنی ارے اتنا مجھے اتنا جلایا
انھیں بخشی وہ خوئے جاں نوازی کہ عہدِ شوق میں مرنے نہ پایا
بنا عشق ایک رسمِ وضع داری زبانِ شوق کو اتنا بڑھایا
پڑیں وہ وقت کی ضربیں مسلسل کہ عشق اپنے لہو میں خود نہایا
بجھا کر مشعلِ رخسارِ جاناں مرے احساس میں لو کا لگایا

لب و رخسار پر کی برف باری
اور اتنی اک شرر بچنے نہ پایا

رخِ شاداب کی صبحِ طرب پر غم آ گئیں جھٹ پٹے کا رنگ چھایا
جو طاقِ خال و خد میں جل رہے تھے تہہ جلد ان چراغوں کو بجھایا
شبِ آخر کی ڈھلتی چاندنی نے مرتب سطحِ دریا کو ہلایا

دریغا دھاریوں کو چور کر کے گلابی پنکھڑی کو کھردرا یا
سبک لچکے کی ڈوری توڑ ڈالی ! سجل مکھڑے کے خیمے کو گرایا
قیامت ہے کہ پائے تیرگی پر مرے ماہِ مبیں نے سر جھکایا
جہاں جلتے تھے پر وقتِ روانی
وہاں طوفانِ ماہ و سال آیا

مرے اشعار مرکز سے ہٹائے مرے نغموں کو پردیسی بنایا
مری نظروں کے کنگن توڑ ڈالے مری تخئیل کا زیور بڑھایا
جو تھی برکھا کی راتوں کا نشیمن مجھے اس زلف میں ٹرکا دکھایا
گلے پر حصر ہے جس کے سخن کا مجھے پیہم کلام ان کا سنایا
ارے نادان نقادوں کے ہاتھوں مری نظموں کو سولی پر چڑھایا
انھیں میرا بنایا دشمنِ جاں جنھیں میں نے کلیجے سے لگایا
مجھے قصرِ سلاطیں میں بٹھا کر
مری خودداریوں کا منہ چڑھایا

مری حالت پہ طاری کی گدائی مری فطرت کو شاہانہ بنایا
مری ہر شام کو تسکین دے کر مری ہر صبح کو در در پھرایا
جو تھا مجھ میں غرورِ کبریائی بحد بندگی اس کو گرایا
مورخ تھے جو میری زندگی کے انھیں چن چن کے دنیا سے اٹھایا
مرے گلزار میں کانٹے اگائے مرے شعلوں کو خاکستر بنایا
لگا کر آگ میرے خال و خد کو اور اس کے بعد آئینہ دکھایا
جب اک بوڑھا سا آئینے میں دیکھا
میں رویا، قہقہہ سب نے لگایا

بتوں نے پھیر لیں مجھ سے نگاہیں — زمانے نے مجھے یہ دن دکھایا
یہاں المختصر ابرِ مسرت — جو چھایا بھی تو کچھ اسطرح چھایا
دہکتی خاک پر جس طرح پل بھر — کسی اڑتے ہوئے طائر کا سایا

نفس کی آمد و شد اللہ اللہ
مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

(اذکار۔ بیادگار جوش ۔ ۱۲۹)

میرے بعد

نہ وہ الفاظ کے نغمے، نہ وہ معنی کا سرود
گنگ ہے مطرب انداز بیاں میرے بعد
تیر دل پر وہ لگا ہے کہ لچکی ہی نہیں
ابروئے شعر کی گل ریز کماں میرے بعد
پھر الوہیت انساں کا تصور ہے خجل
پھر جبینوں پہ ہیں سجدوں کے نشاں میرے بعد

بے جھجک ہو کے اٹھایا ہے پھر اور ادنے سر
کھل کے گونجی ہے پھر آوازِ اذاں میرے بعد

پھر حقائق سے ہیں مصروفِ تمسخر اوہام
پھر یقیں پر متبسم ہے گماں میرے بعد

زندہ افکار کا پرتو نہ رہا ذہنوں پر
مُردہ ہے انجمنِ دیدہ وراں میرے بعد

زرد ہے چہرۂ گل رنگ نگارِ دانش
تیرہ ہے محفلِ صاحب نظراں میرے بعد

وائے تقدیر کہ پھر عقل و جنوں کے مابین
کوئی باقی نہ رہا ربطِ نہاں میرے بعد

اپنے الفاظ کی میت کو سرِ دوش اٹھائے
محوِ فریاد ہے سلمائے زباں میرے بعد

کروٹیں شام سے تا صبح بدلتے ہیں نجوم
یوں دھڑکتا ہے دلِ زہرہ وشاں میرے بعد

نہ رہا کوئی ادا سنجِ حسینانِ جہاں
سر بہ زانو ہیں حسینانِ جہاں میرے بعد

آخری مشتریٔ جنسِ جوانی نہ رہا
بند ہے غرفۂ خوبانِ جہاں میرے بعد

پڑ گئے قفل، اداؤں کے صنم خانوں میں
سرنگوں ہے علمِ نازِ بتاں میرے بعد

ہو گیا قحط خریداریٔ مے کے باعث

چشمِ عالم میں سبک، رطلِ گراں میرے بعد
چاندنی تک ہے خرابات میں دھندلی دھندلی
یوں سیہ پوش ہیں رندانِ جہاں میرے بعد

اب کسے قدر کھنکتے ہوئے پیمانوں کی
بند ہے کارگہہ شیشہ گراں میرے بعد
آخری شمعِ خرابات ہوئی ہے خاموش
اٹھ رہا ہے دلِ ساقی سے دھواں میرے بعد

اہلِ ماتم کا خرابات سے نکلا ہے جلوس
زیرِ سر کر گئی پیرِ مغاں میرے بعد

اک اُداسی ہے مہکتے ہوئے بستانوں میں
اک اندھیرا ہے سرِ آبِ رواں میرے بعد
کس کو بخشے علمِ ہمتِ گردوں شکنی؟
چشمِ گیتی ہے، بہر سو، نگراں میرے بعد

حیف اے خسروی کاکل و کونین و کتاب
کس کو سونپیں گے ترا طبل و نشاں میرے بعد

حیف یہ صاعقہ و صرصر و سیلاب و سموم
کس کی آغوش میں پائیں گے اماں میرے بعد
سر بہ زانو ہیں امامانِ خرابات اے جوش
کون ہو قبلۂ رندانِ جہاں میرے بعد

۱۹۴۸ (سموم و صبا) ص۔ ۴۰

الوداع

اے ملیح آباد کے رنگیں گلستاں الوداع
الوداع اے سرزمینِ صبحِ خنداں الوداع
الوداع، اے کشورِ شعر و شبستاں الوداع
الوداع، اے جلوہ گاہِ حسنِ جاناں الوداع

تیرے گھر سے ایک زندہ لاش اٹھ جانے کو ہے
آ گلے مل لیں کہ آوازِ جرس آنے کو ہے

آ کلیجے میں تجھے رکھ لوں مرے "قصرِ سخن"
اس کتابِ دل کے ہیں اوراق تیرے بام و در
جا رہا ہوں، تجھ میں کیا کیا یادگاریں چھوڑ کر
آہ کتنے طور خوابیدہ ہیں تیرے بام پر

روح ہر شب کو نکل کر میرے جسمِ زار سے
آ کے سر ٹکرائے گی تیرے در و دیوار سے

ہائے کیا کیا نعمتیں مجھ کو ملی تھیں بے بہا
یہ خموشی، یہ کھلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا
وائے یہ جاں بخش بستاں، ہائے رنگیں فضا
مر کے بھی ان کو نہ بھولے گا دلِ درد آشنا

مست کویل جب دکن کی وادیوں میں گائے گی
یہ سبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئے گی

کل سے کون اس باغ کو رنگیں بنانے آئے گا
کون پھولوں کی ہنسی پر مسکرانے آئے گا
کون اس سبزے کو سوتے سے جگانے آئے گا
کون ان پودوں کو سینے سے لگانے آئے گا

جوشؔ کے مکان واقع امانی گنج، ملیح آباد کا نام

کون جائے گا قمر کے ناز اٹھانے کے لئے
چاندنی راتوں کو زانو پر سلانے کے لئے

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پرخروش
میری فرقت میں لہو روئے گی چشمِ مے فروش
اس کی بوندیں جب اڑا دیں گی گلستانوں کے ہوش
کنجِ رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں جوش جوش
سنکے میرا نام موسم غم زدہ ہو جائے گا
ایک محشر گلستاں میں بپا ہو جائے گا

صبح جب اس سمت آئے گی برافگندہ نقاب
آہ کون اس دل کشا میداں میں چھیڑے گا رباب
اس افق پر شب کو جب انگڑائی لے گا ماہتاب
چاندنی کے فرش پر لہرائے گا کس کا شباب

جگمگائے گی چمن میں پنکھڑی کس کے لئے
رنگ برسائے گی ساون کی جھڑی کس کیلئے

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار

سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اب وجد کا وقار
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار
پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار

شمع خلوت میں ہے روشن، تیرگی محفل میں ہے
رُخ پہ گردِ بے کسی، شانِ ریاست دل میں ہے

کوچ کا پیغام لے کر آگیا مہر منیر
گھر کا گھر ہے وقفِ ماتم، زرد ہیں برناؤ پیر
رخصتِ بلبل سے نالاں ہیں چمن کے ہم صفیر
آ رہی ہے کان میں آواز گویا[1] و بشیر[2]

چھٹ رہا ہے ہاتھ سے دامن ملیح آباد کا
رنگ فق ہے عزت دیرینۂ اجداد کا

کیا بتاؤں دل پھٹا جاتا ہے میرا ہم نشیں
آئیں گے یاں خرمنِ اجداد کے جب خوشہ چیں
آ کے دروازے پہ جیسے ہی جھکائیں گے جبیں
گھر کا سناٹا صدا دے گا، "یہاں کوئی نہیں!"

---

[1] جوش پردادا [2] جوش کے والد

جود و بخشش کا کلیجہ غرقِ خوں ہو جائے گا
میرے گھر کا پرچم زر سرنگوں ہو جائے گا

آہ اے دورِ فلک! تیرا نہیں کچھ اعتبار
مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار
فکرِ دنیا، اور شاعر، تف ہے اے لیل و نہار

موج کوثر وقف ہو، اور تشنہ کامی کیلئے
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے

آ گلے مل لیں خدا حافظ گلستانِ وطن
اے امانی کنج کے میدان اے جانِ وطن
الوداع اے لالہ زار و سنبلستانِ وطن
السلام اے صحبتِ رنگین یارانِ وطن

حشر تک رہنے نہ دنیا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

۱۹۲۴ء

(نقش و نگار۔ ص۔ ۵۵)

رباعیات

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوب سخن کا نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

اپنے ہی دماغ و دل کا مقہور ہوں میں
خود اپنے ہی دل میں ایک ناسور ہوں میں
واقف ہوں کہ سوچنے میں ہے جی کا زیاں
کیا کیجئے، سوچنے پہ مجبور ہوں میں

پامال غم انسان ہوا جاتا ہے
بے چارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو آتا ہے فرشتوں کا جمود
بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے
آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تجھ کو
اے شدتِ غم پہ مسکرانے والے!

ہر صاحب جوہر کو سبک سر کر دے
فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کر دے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کم بخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

کیا جانئے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے
دل رنج و الم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

خنجر ہے کوئی، تو تیغ عریاں کوئی
صرصر ہے کوئی تو بادِ طوفاں کوئی
انسان کہاں ہے؟ کس کرے میں گم ہے؟
یاں تو کوئی "ہندو" ہے "مسلماں" کوئی

اک فتنہ ہے ناقصوں میں کامل ہونا
اک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
تاریخ کے اوراق جو الٹے تو کھلا
اک جرم ہے احمقوں میں عاقل ہونا

افسوس یہ سن، یہ بدحواسی تیری
دل ہی نہیں، روح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو منہ اترنے لگتا ہے ترا
کس درجہ مکمل ہے اداسی تیری

پابند ہراس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
آشفتہ حواس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
بکھ پر تو ہے انبساطِ عالم کا مدار
تو اتنی اداس کیوں ہے؟ تیرے قرباں

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا ترے درد، عیاذاً باللہ
لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

کہنا یہ ترا نیند کسے آتی ہے
راتوں کو طبیعت اور گھبراتی ہے
اُف سیج کے نامراد پھولوں کی مہک
ہر سانس میں اک پھانس سی چبھ جاتی ہے

ہے صبحِ افق سے جگمگانے والی
وعدے پہ ہے ان کے مسکرانے والی
جا پچھلے پہر کے چاند! ان سے کہہ دے
اب رات ہے دو گھڑی میں جانے والی

برسات ہے دل کو ڈس رہا ہے پانی
فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی
دل میں کبھی چبھتا ہے کلیجے میں کبھی
آڑ اتر چھا برس رہا ہے پانی

ناگن بن کے مجھے نہ ڈسنا بادل!
یاراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل!
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل!

چونکا ہے کوئی نگارِ الٰہی توبہ
رس میں ڈوبا خمارِ الٰہی توبہ
سسکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا
ہونٹوں کا خفیف ابھار الٰہی توبہ!

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کے مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے، روکے، سحر کو روکے کوئی

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی
کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا "جوشؔ مجھے کہتے ہیں"
آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی

پُر ہَول شکم، عریض سینے والو
خوں، قوم تہی دست کا پینے والو
تم اہلِ خِرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد
خیرات پہ احمقوں کی جینے والو

اے شیخ کبھی تو رنج اٹھایا ہوتا
اس دل پہ کبھی تو زخم کھایا ہوتا
اس طرح لگاتا نہ دمادم ضربیں
بابا! دل اگر کہیں لگایا ہوتا

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں؟
اتنا ہی کہ بس "صل علیٰ" کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر، ایں ریشِ دراز
موقع ہو تو ہر "بت" کو خدا کہتے ہیں

ہشیار! کہ آفتاب ہونا ہے تجھے
پیغمبرِ انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا
بیدار! کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

جو غم کو نہ دیکھے وہ نظر دے ساقی
انگور سے دل کے زخم بھر دے ساقی
قاتل ہے کوئی چیز تو احساسِ لطیف
اس تیغ کی باڑھ کُند کر دے ساقی

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسم ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انساں سے ٹکر ایسی
ہر دین کے ہاتھ سے لہو جاری ہے

غالب ہے مرا جذبۂ غیرت مجھ پر
اک قہر ہے ناکسوں کی صولت مجھ پر
زاہد اگر آج مے کو جائز کر دے
اک قطرہ بھی پھر یوں تو لعنت مجھ پر

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کر کے؟
کیا پائے گا توہین جوانی کر کے؟
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں!
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
میں روحِ مئے ہوش ربا ہوں تسلیم

کس رات کو کی نہ بادہ خواری ہم نے
کب کاکلِ عشرت نہ سنواری ہم نے
اب تک تو یہ رات جس کو کہتے ہیں شباب
زلفوں ہی کے سائے میں گذاری ہم نے

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سرتابقدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہرِ مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

بھٹکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے ترانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو سد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا فسانہ اپنا

جب رخت شباب پارا پارا ہوگا
دل کو رونے کا بھی نہ یارا ہوگا
حیراں ہوں کہ داغِ شیب و ننگ پیری
کیوں کر مری غیرت کو گوارا ہوگا

کیا عمر کے ساتھ جوش چلتا چہرہ؟
کیوں شیب کے سانچے میں نہ ڈھلتا چہرہ؟
"جذبات" یہ چہرہ وقت پر عمر سوار
کیوں عمر سے آگے نہ نکلتا چہرہ؟

افسردہ نہ بن، لوگ برا مانتے ہیں
منہ اترے تو دوست اجنبی جانتے ہیں
چہروں کی شناخت اہل دنیا کو نہیں
چہروں کی فقط یہ آپ پہچانتے ہیں

اب خواہشِ لذات نہیں ہو سکتی
اب دن کے سوارات نہیں ہو سکتی
در کس کئے کھٹ کھٹا رہی ہے دنیا
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

سادہ ہوں کب کسی سے ڈرتا ہوں میں
دوزخ سے نہ زندگی سے ڈرتا ہوں میں
اس طنطنہ و بہادری کے باوصف
دنیا! ترے آدمی سے ڈرتا ہوں میں

کتابیات

روحِ ادب	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ سنہ ۱۹۲۱ء پہلا ایڈیشن	۱۹۲۱ء
نقش و نگار	"	" مکتبہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی	۱۹۳۶ء
شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۳۶ء
فکر و نشاط	" "	" "	۱۹۳۷ء
حرف و حکایت	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی	۱۹۳۸
آیات و نغمات	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور	۱۹۴۱ء
عرش و فرش	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ کتب خانہ تاج آفس بمبئی	۱۹۴۴
رامش و رنگ	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ قومی دارالاشاعت بمبئی	۱۹۴۵ء
سنبل و سلاسل	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ تاج آفس بمبئی	۱۹۴۷
سیف و سبو	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ	۱۹۵۲ء
سرود و خروش	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ	۱۹۵۲ء
سموم و صبا	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ مفید عام پریس دہلی	۱۹۵۳ء
الہام و افکار	جوش ملیح آبادی	مطبوعہ جوش اکاڈمی کراچی	۱۹۶۷ء
افکار جوش نمبر	ایڈیٹر صہبا لکھنوی	کراچی	۱۹۶۱ء
افکار، بیادِ جوش	ایڈیٹر صہبا لکھنوی	کراچی (انتقال کے بعد شائع ہوا ہے)	۱۹۸۲